(غلام گردش)

سوچنا بہت بڑا جرم ہے؟

پورے نظام میں سوچنے اور سمجھنے پر مکمل پابندی لگی ہوئی ہے۔اس میں کسی بھی حکومت کا عمل دخل کافی حد تک کم بلکہ محدود ہے۔اسکے متضاد ہماری طرزِ زندگی، سماجی رویوں اور چند مذہبی تاویلوں نے وہ دیوار کھڑی کر دی ہے، جنہیں کم از کم کوئی فانی انسان پار نہیں کر سکتا۔ ہمارے عظیم مذہب کو تقلید کے ترازو میں تولا جاتا ہے۔ وہی صدیوں پرانی تقلید، جسے علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کیلئے زہرِ قاتل قرار دیا تھا۔ بہر حال ماحول ایسا بنا دیا گیا ہے کہ کوئی بھی نئی بات سوچنے پر ڈر لگنا شروع ہو جاتا ہے۔لکھنا تو خیر بہت دور کی بات ہے۔

معاشرے میں خوف اس قدر زیادہ سرایت کر چکا ہے کہ سنجیدہ طبع لوگ بھی کچھ کہنے سے گریز کرتے ہیں۔ ویسے مثال دینی تو نہیں چاہیے کیونکہ مثال بھی مشکل میں ڈال سکتی ہے۔مگر اسکے بغیر بات نہیں بنتی۔ حالیہ عیدالاضحیٰ کے متعلق وزیر سائنس وٹیکنالوجی، فواد چوہدری نے بنیادی سائنس کا سہارا لیکر ایک مخصوص دن کا تعین کیا تھا۔ وزیر کے بقول، چاند کو آنکھ سے دیکھنا قطعاً ضروری نہیں ہے۔ میں کوئی عالم نہیں ہوں۔ بلکہ اب تو لگتا ہے کہ جاہل سے بھی نچلی سطح پر سانس لینے پر مجبور ہوں۔مگر رویت ہلال کمیٹی کے مستقل سربراہ، مفتی منیب نے وزیر کی بات کی فوری تردید کر ڈالی۔انہوں نے بھی فرنگیوں کی بنائی ہوئی دوربین کا سہارا لیکر حکم صادر فرما دیا کہ نہیں، سائنس کا وزیر غلط کہہ رہا ہے۔عید اسکے اگلے دن ہوگی۔ طالبعلم یا اکثریت کو فرق نہیں پڑتا کہ عید کس دن منائی جاتی ہے۔ ویسے بیماری اور وباء کے دوران روایتی عید کا کتنا جواز رہ جاتا ہے۔اس پر تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔ لازم ہے جو کہ بالکل نہیں کی گئی۔لیکن ایک چیز تو سامنے آ گئی کہ عید کے دن کا تعین، وزیر سائنس کے حوالے سے نہیں ہوگا۔فواد چوہدری نے بھی علماء اکرام سے کوئی اختلافی بات نہیں کی۔ روایتی سمجھداری سے کام لیتے ہوئے سر جھکا کر خاموش ہو گئے۔ یہاں ایک نکتہ گوش گزار کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ناسا جو کہ خلائی تحقیق کا دنیا میں سب سے معتبر ادارہ ہے۔اس نے اگلے ایک ہزار سال کا کیلنڈر ترتیب دیدیا ہے۔کوئی بھی اس سے استفادہ کر سکتا ہے۔نتیجہ یہ کہ اگلی کئی صدیوں میں عید کب ہوگی۔اسکا سائنسی تعین کیا جا چکا ہے۔مگر یہ بات کرنی خطرے سے خالی نہیں۔ کیونکہ جب حکومت، مولانا منیب کو ناراض کرنے کی سکت نہیں رکھتی، تو ایک عامی کی کیا مجال کہ کہہ سکے کہ چاند دیکھنے کے معاملات سائنس کی رو سے طے ہونے چاہیے۔ ہاں، ایک خلش تو ہے دل میں کہ ہمارے کوئی مذہبی عالم بیانگ دہل فرماتے، کہ پاکستان سمیت پوری دنیا میں کرونا وباء موجود ہے۔اس بار قربانی کی بجائے، پورے پاکستان کے لوگ قربانی کی رقم سے ایک فنڈ قائم کریں۔جس سے کرونا کی تحقیق شدہ دوا خریدی جائے تا کہ غریب اور سفید پوش لوگوں میں مفت تقسیم کی جا سکے۔ یہ اسلیے بھی ضروری ہے کہ دنیا کے ترقی یافتہ کافر ممالک دوا بنانے کے نزدیک پہنچ چکے ہیں۔ ہماری حکومت اربوں روپے کے قربانی فنڈ سے یہ دوا خرید کر لاکھوں نہیں کروڑوں زندگیوں کو محفوظ بنا سکتی تھی۔اور بھی اَن گنت مثالیں ہیں۔مگر بات کرنی مشکل ہو جاتی ہے۔ ویسے برا نہ منایئے گا۔ہمیں دلی طور پر سائنس تحقیق اور جدید علوم سے نفرت ہے۔یقین نہ آئے تو تجزیہ کر کے دیکھ لیجئے۔

ویسے جس ملک میں صرف اور صرف سیاست اور چرب زبانی ہو، وہاں کسی دیگر موضوع پر بات کرنا نامناسب

سا ہے۔اخبار اُٹھا کر دیکھ لیجئے۔بے معنی بیانات، لایعنی تنقید اور ہزیانی کالم نظر آئینگے۔کیا یہ عجیب بات نہیں کہ تہتر برس سے کسی بھی صوبائی یا وفاقی حکومت نے یہ نہیں سوچا کہ ملک کے قابل ترین عالم، محقق، استاد یا سائنسدان کو عزت دینے کیلئے گورنر یا صدر کے عہدے پر فائز کر دیا جائے۔اگر کسی ایسے نیوکلیئر سائنسدان کو جس نے ملک کی حفاظت کو یقینی بنایا ہے، کسی صوبہ کا گورنر یا ملک کا صدر بنا دیا جائے تو پوری دنیا میں ہماری تکریم بڑھ سکتی ہے۔چلیے، جن پاکستانیوں نے نوبل پرائز لیا، انہیں تو ہم یہودیوں کا ایجنٹ گردانتے ہوئے رَد کر ڈالتے ہیں۔جو کہ بذاتِ خود ایک تعصب پر مبنی ہے۔ان سے درگزر کر کے موجودہ زندہ پاکستانی سائنسدانوں یا اہلِ دانش میں سے کسی کو اگر ان عہدوں پر تعینات کر دیا جائے، تو خود فیصلہ فرمائیے کہ اس سے ہمارے ملک کی ساکھ میں کس قدر اضافہ ہوگا۔کسی کا نام نہیں لکھنا چاہتا۔مگر ہمارے پاس ایسے قدآور لوگ موجود ہیں، جو گورنر یا صدر کے عہدے کو مزید عزت بخش سکتے ہیں۔پر نہیں، ہم فضل الٰہی یا ممنون حسین یا تارڑ جیسے لوگوں پر اکتفا کرنا پسند کرتے ہیں۔آپ کسی بھی سیاستدان کو یہ تجویز دیکر تو دیکھیے۔بات سننے کے بعد دماغی امراض کے ڈاکٹر سے علاج کروانے کا مشورہ دیگا۔یہ ہے، ہمارے سماج میں اہلِ ہنر کی عملی وقعت۔آگے بات کرنا بالکل عبث ہے۔اسکے برعکس ہندوستان نے اپنے مکمل غیر سیاسی، ایٹمی سائنسدان عبدل الکلام کو صدر بنا کر بہرحال ایک اچھی روایت قائم کی ہے۔وہ 2002 سے 2007 تک ہندوستان کا صدر رہا۔ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ اس قد کاٹھ کے سائنسدان کو صدر بنانے سے قصرِ صدارت کی عزت میں اضافہ ہوا۔ہمارے سیاسی نظام کے ساہوکاروں کو اس طرف سوچنا چاہیے۔پر نہیں۔غلط لکھ گیا۔یہاں سوچنے کی کیا ضرورت ہے بلکہ کیا گنجائش ہے۔لہذا، سب کچھ ایسا ہی چلتا رہیگا۔

ایک اور عرض کرنا چاہتا ہوں۔چند دن قبل، حادثاتی طور پر کرنٹ آفیئر کا ایک تماشا نہیں نہیں، غلط لکھ گیا، پروگرام دیکھ رہا تھا۔ہمارے ملک کے ایک جید ترین تجزیہ نگار گوہر افشانی فرما رہے تھے۔فرماتے تھے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ایک نیا سیاسی روڈ میپ ترتیب دیا جائے۔اسکے لیے اعلیٰ سوچ کے لوگ اکٹھے کیے جائیں۔پھر انہوں نے بیس سال پرانے افسروں کے نام لیے، جو کہ انکے ذاتی دوست ہیں کہ انکو لیکر ایک نئی سیاسی شطرنج کی بساط کو ترتیب دیا جائے۔بادی النظر میں تو یہ کمال کا آئیڈیا معلوم ہوتا ہے۔مگر گہرائی سے سوچیے تو اسکے اندر بلا کی سطحیت معلوم ہوتی ہے۔ٹھنڈے دل سے سوچیے۔سیاسی روڈ میپ تو قائداعظم مکمل طور پر بتا کر راہِ فنا پر روانہ ہوئے تھے۔انکی تقاریر، نوٹس اور گفتگو کے اَن گنت قطعات موجود ہیں، جہاں انہوں نے پاکستان کو ایک فلاحی ریاست بنانے کا حکم دیا تھا۔وہ تو تعصب سے اس قدر بالاتر تھے کہ حیدرآباد میں ہندو تاجروں کے پاس اپنے اے۔ڈی۔سی کو بھجوایا تھا کہ آپ لوگ پاکستان رہیں اور دلجمعی سے کاروبار کریں۔ریاست آپکی حفاظت کریگی۔یہ ایڈوانی خاندان تھا۔جنہوں نے گورنر جنرل کے سٹاف کو بتایا کہ پورا خاندان ہندوستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔قائداعظم نے تو گیارہ اگست کو تقریر فرما کے ہمارے دستور کا خاکہ تک دیدیا تھا۔مگر انکی وہ تقریر پاکستان ریڈیو نے سینسر کر ڈالی۔یعنی جس عظیم رہنما نے ہمارے جیسے عامیوں کیلئے نیا ملک بنایا، ہم نے اسکی تقریر کو بھی سیکیورٹی رسک اور ریاست کے خلاف قرار دے ڈالا۔تقریر کا اصل مسودہ، ریڈیو سٹیشن دہلی سے لایا گیا۔جواب ہمارے پاس محفوظ ہے۔یعنی جو موصوف یعنی تجزیہ نگار ''گلہائے علم'' بکھیر رہے تھے۔وہ تو قائداعظم کے فرمودات سے بھی بالاتر ہو کر تقریر فرما رہے

تھے۔ویسے،انکی تعلیم میٹرک سے بھی کم ہے۔یہ میں نے تصدیق کے بعدلکھا ہے۔خالقِ پاکستان نے ہمیں جو کچھ بتایا،ہم اسکو بھی خاطر میں لانے کیلئے تیار نہیں ہیں،تو باقی کیا رہ گیا۔علامہ اقبالؒ کے ساتھ بھی ہمارا عملی سلوک ایسا ہی ہے۔یقین ہے کہ انکی زندگی کی علمی کشید شدہ کتاب،The Reconstruction of Religous Thought in Islam ہمارے ناوے فیصد سنجیدہ لوگوں نے نہیں پڑھی ہوگی۔یہی وہ علم کا خزانہ ہے،جسکو لکھنے پر اقبال جیسے قابل شخص کو ہندوستان کے مذہبی پیشواؤں نے اسلام سے خارج کر دیا تھا۔مگر اس کتاب میں ہر وہ فکری اُصول موجود ہے،جس سے ہم فائدہ اُٹھا سکتے تھے۔قیامت تو یہ ہے کہ ہم علامہ اقبالؒ کو خاطر میں نہیں لاتے،تو پھر آگے کسی کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے۔بہر حال جس دھڑلے سے وہ تجزیہ کار،بے معنی باتیں فرما رہے تھے۔اس پر صرف افسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔بلکہ افسوس کیوں،ہماری اکثریت بالکل انہی کی طرح سوچنے کی کوشش کرتی ہے۔

علمی زبوں حالی پر بات کرتے ہوئے،ایک دیرینہ دوست،ڈاکٹر عبداللہ محسن نے سوال اُٹھایا کہ گزشتہ سو برسوں میں مسلمانوں کے پاس اتنے کم نوبل پرائز کیوں ہیں؟ میرے پاس اس سوال کا جواب تو موجود ہے پر اسے لکھنا اَز حد دشوار ہے۔فکری قحط کا عالم دیکھیے کہ گزشتہ ایک سو برس میں مسلمانوں کے پاس صرف بارہ نوبل پرائز ہیں۔ان میں سے صرف تین سائنسی علوم پر ہیں۔باقی امن کے متعلق ہیں۔اسکے برعکس اگر کرہِ اَرض پر مسلمانوں کی تعداد دیکھیں تو نظر آتا ہے کہ 1.8 ارب لوگ مسلمان ہیں۔یعنی تقریباً دو ارب لوگ،صرف اور صرف بارہ نوبل پرائز حاصل کر پائے ہیں۔اب ذرا یہودیوں کی طرف آیئے۔دنیا میں انکی آبادی پندرہ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔کیا جاننا چاہینگے کہ انکے پاس نوبل پرائز کتنے ہیں۔قطعی تعداد لکھنے کی شرمندگی سے بچنے کیلئے عرض ہے کہ آج تک نو سو نوبل پرائز دیے گئے۔اسکا بیس فیصد صرف اور صرف یہودیوں کے پاس ہیں۔یعنی تقریباً ڈھائی سو کے قریب۔بارہ اور ڈھائی سو نوبل پرائز کا تقابلی جائزہ شائد آپ کر سکتے ہیں۔میرا جیسا جاہل تو نہیں کر سکتا۔وجوہات سب کے علم میں ہیں۔مگر کھل کر ذکر کرنا اَز حد دشوار ہے۔علم دشمنی،جدید علوم سے نفرت،اندھی تقلید اور عمل سے خالی زندگی چند عناصر ہیں۔جس نے دو ارب لوگوں کو بے معنی بنا دیا ہے۔ڈاکٹر عبداللہ محسن کے سوال سے گھبرا چکا ہوں۔کیا جواب دوں،کہنے کو کچھ ہے ہی نہیں۔جن معاشروں میں سوچ کے اردگرد آہنی دیواریں آراستہ ہوں،وہاں سوال کرنا ہی گناہ ہے؟ جواب حاصل کرنا تو خیر ناممکن ہے؟

راؤ منظر حیات